ہیں۔ اور جو اس طرح نہیں بندھنا چاہتیں انہیں بے حیا، بدچلن اور آوارہ منش قرار دے دیا جاتا ہے۔

باب نکاح میں عورت کے انتخاب کا مسئلہ بھی اتنا ہی زیادہ اہم ہے جتنا مرد کے انتخاب کا۔

قرآن نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ (البقرہ ۲:۱۸۷) لباس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ جسم کے مطابق ہو، اور جو لباس بدن کے مطابق نہ ہو اسے نہیں پہنتے۔ تاکہ شخصیت غیر متوازن نہ ہو۔ ''ھن لباس لکم'' کا مطلب یہی ہے کہ عورتیں مردوں کا ذوق انتخاب ہیں۔ اور ''وانتم لباس لھن'' کا مطلب یہ ہے کہ مرد، عورتوں کا ذوق انتخاب ہیں۔ یوں مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے پسند فرمودہ ہوتے ہیں۔ چاہتوں کے اٹوٹ انگ بن کر تمام زندگی محبتیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے لیے دلچسپی کا سامان بنے رہتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا یہ سفر دونوں کو تا زیست خوش و خرم رکھتا ہے۔ میاں بیوی کی یہ محبتیں اور پسندیدگیاں ان کے بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ ایسے جوڑوں کے بچے کسی نفسیاتی اور اخلاقی الجھنوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ غربتوں میں بھی خوشحال نظر آتے ہیں۔ مقابلتاً ان جوڑوں کے، جو مارے باندھے کے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ باوجود مالدار ہونے کے بیمار اور پریشان نظر آتے ہیں۔ باہمی نفرتوں اور عدم محبتوں میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ وقت سے پہلے بوڑھے اور مضمحل ہو جاتے ہیں۔ انکی عائلی زندگی کا زہر ان کے بچوں میں تلخیاں گھول دیتا ہے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اخلاقی و نفسیاتی مفاسد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس طرح کے جوڑے، معاشرہ کو اچھی پروڈکشن دینے سے قاصر ہوتے ہیں اس لیے دو طرفہ پسند کی شادی، صرف مرد و عورت کی ہی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے سماج کی بھی ضرورت ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ امام راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، واصل الطیب ما تستلذہ الحواس وما تستلذہ النفس۔

۲۔ الصحیح المسلم، رقم الحدیث ۳۴۸۱، باب ندب من اراد نکاح امراۃ الیٰ ان ینظر الیٰ وجھھا و کفیھا قبل خطبتھا۔

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ ﷺ، ترجمہ پروفیسر خالد عزیز، ص ۲۹۶، بیکن بکس، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، اشاعت دوم ۲۰۰۴ء

۴۔ الصحیح المسلم، رقم الحدیث ۳۴۷۴، قدرے تغیر لفظی کے ساتھ ایک اور حدیث متصل ہے۔ (۳۴۷۳)

۵۔ ایضاً ۳۴۷۴

٦۔ الصحیح البخاری، جلد اول ص ۸۷۸،۷۷۷، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ

۷۔ امام ابو بکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) المصنف ج ۳، ۴، ص ۱۳۲، ۱۳۳، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ

۸۔ ایضاً ص ۱۳۲

۹۔ ایضاً ص ۱۳۳

جہیز ــــ ایک معاشرتی بوجھ

جہیز سے مراد وہ سامان ہے جو شادی کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے والوں کو دیا جاتا ہے۔ اس سامان کو شادی کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔ جو یہ سامان نہ دے یا نہ دے سکتا ہو تو وہاں شادی کا تصور تک نہیں کیا جاتا۔ یہ سامان جہیز ایک طول طویل فہرست پر مشتمل ہوتا ہے، جو ضروریات اور تحسینیات سے بڑھ کر تعیشات تک جا پہنچتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ سامان بالکل فرمائشی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جسے پورا کرنا لڑکی والوں کی ذمہ داری قرار دیا جاتا ہے اور جہاں یہ فرمائشی نہیں ہوتا وہاں بھی بالعموم فرمائشی جیسا ہوتا ہے۔ اور اس اہتمام کو لڑکے والوں کی خاموش فرمائش تصور کر لیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر غریب خاندان کی لڑکیاں اس لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ اور متوسط گھرانے کی لڑکیاں سامان جہیز میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں برباد ہو جاتی ہیں۔ جہیز کی طلب اور رسد نے ''نکاح'' جیسے ضروری، فطری اور پاکیزہ و حلال عمل کو پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔ اسی لیے جہیز کی پابندی نے بعض لڑکیوں کو شرم و حیا سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ان میں غربت و افلاس کی وجہ سے ''منکوحہ'' بننے کی شرط مفقود ہو چکی ہے۔ نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ چاہے جانے کی فطری اور منہ زور خواہش نیز جنسی عمل کی تحریک بالآخر انہیں بدقوارگی کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس راہ کا مسافر تمام زندگی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی بھٹکاتا رہتا ہے۔

جہیز کے فرض، واجب یا سنت ہونے کا کوئی تصور ہماری شریعت میں موجود نہیں ہے۔ شادی کے وقت گھر والوں کی طرف سے بہ طیب خاطر، اگر کوئی تحفہ یا ہدیہ پیش کر دیا جائے تو وہ جہیز کے ضمن میں نہیں آتا۔ پھر یہ کہ تحفہ کی شرعی حیثیت اس لزوم کے ساتھ بھی بہر حال نہ تو فرض حتمی ہے نہ واجب اور نہ سنت۔ زیادہ سے زیادہ اسے مستحب کے زمرہ میں لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی فعل

استحباب کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے تو وہ بدعت بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اسی بدعت میں مبتلا ہے۔ شریف بیٹیاں اپنے باپوں کی دہلیز پر زندہ درگور ہو گئی ہیں۔

واذ الموءدة سئلت بای ذنب قتلت۔ (التکویر ۸۔۹)

اور جب زندہ درگور سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم پر ماری گئی۔

ہمارے خیال میں جہیز وہ معاشرتی آلہ قتل ہے، جس سے ہماری بیٹیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ معاشرہ کا اجتماعی ضمیر اس قتل عام کو روکنے میں اپنا موثر کردار ادا کرے۔

جہیز کا لفظ آج جس معنی میں بولا جاتا ہے عہد رسالت مآب ﷺ میں اس معنی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ جہیز کے سنت ہونے کی غلط فہمی جس روایت سے اخذ ہوئی ہے۔ پہلے ہم وہ روایت درج کرتے ہیں اور بعد میں اسکی تفصیل کرتے ہیں۔

عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال جھز رسول اللہ ﷺ فاطمة فی خمیل وقربة ووسادة حشوھا اذخر۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ کو نکاح کے لیے تیار کیا اور انہیں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک ایسے تکیے کے ساتھ جس میں گھاس بھری ہوئی تھی، روانہ کیا۔

یہ روایت جس عنوان کے تحت آئی ہے۔ وہ یہ ہے جھاز الرجل ابنته اور اس کا ترجمہ یہ کر دیا گیا ہے۔ اپنی بیٹی کو جہیز دینے کا بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جھاز کا ترجمہ جہیز سے کیا جائے گا تو پھر اسے سنت رسول ﷺ ماننے کی سبیل پیدا ہو جائیگی۔ اسی طرح روایت میں جھز کا ترجمہ بھی مذکورہ مترجمین نے "جہیز" کے لفظ سے کیا ہے۔ اور جہیز چونکہ ہمارے ہاں ایک خاص مفہوم میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس غلط فہمی کا پیدا ہونا بھی قدرتی امر ہے۔ حالانکہ از روئے لغت، الجھاز، سفری سامان کو کہا جاتا ہے۔ سفری سامان چونکہ مسافر کی ضرورت ہوتا ہے۔ اس لیے آگے چل کر ہر اس سامان کو کہا جانے لگا جو کسی کی ضرورت ہو اور تجہیز کا لفظ سامان سفر کے اٹھانے یا بھیجنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کی تائید کے لیے آیت ملاحظہ ہو۔

ولما جھزھم بجھازھم۔ (یوسف ۵۹)

اور جب انہیں، ان کے سامان سے تیار کر دیا۔

اس معنی کی رو سے بوقت نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ کچھ ضروری سامان

کا بھیجنا ہمارے معاشرہ کے روز مرہ میں استعمال ہونے والے "جہیز" سے کسی طرح بھی لگا نہیں کھاتا۔ کیونکہ اسی مفہوم کی ایک روایت سنن ابن ماجہ میں جو آئی ہے، اس میں اس سامان کی نسبت صیغۂ مفرد کے بجائے صیغۂ تثنیہ میں کی گئی ہے۔ اور تثنیہ کے صیغے سے جو مفہوم بنتا ہے وہ علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کو دینے کا بنتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ "جہیز" کی نسبت مرد کی طرف نہیں کی جاتی، روایت ملاحظہ ہو۔

ان رسول اللہ ﷺ اتی علیا و فاطمة وھما فی خمیل لھما والخمیل القطیفة البیضاء من الصوف قد کان رسول اللہ ﷺ جھزھما بھا و وسادة محشوة اذخرا و قربة۔ ۳ ؎

روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک دن علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تشریف لائے اور وہ دونوں ایک چادر میں تھے۔ یہ وہ چادر تھی جو حضور ﷺ نے ان دونوں کو دی تھی اور یہ سفید اونی چادر تھی۔ نیز ایک تکیہ بھی دیا تھا جسمیں گھاس بھری ہوئی تھی اور ایک مشکیزہ بھی دیا تھا۔

اس روایت میں "جہیز" کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں جھز اپنے لغوی معنی میں ہے نہ کہ اصطلاحی معنی میں۔

پھر اس جہیز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سامان، جو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ حضرت علیؓ کے اس مہر کی رقم سے خریدا گیا تھا جو حضرت فاطمہؓ کا مقرر ہوا تھا۔ ایک روایت کی رو سے آنحضرت ﷺ نے چونکہ حضرت علیؓ کی حطمی زرہ کو مہر قرار دے دیا تھا۔ ۴؎ اور اس سامان کے لیے اسی زرہ کو بیچا گیا تھا۔ اس لیے اس سامان کو ہم عرفی جہیز سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

دراصل اس سامان کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ شادی کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کو ایک نئے مکان میں شفٹ کرنا تھا۔ جو انہیں ان کے ایک صحابی حضرت نعمان بن حارثہؓ نے اسی مقصد کے لیے گفٹ کیا تھا۔ چنانچہ نئے مکان میں شفٹ ہونے کے لیے ضروری اشیاء کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس سامان کی علت بس یہی تھی۔ اس لیے اسے کسی طرح بھی "جہیز" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر یہ جہیز ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس طرح کا سامان اپنی دوسری بیٹیوں کو بھی دیتے! آپ کی ازواج مطہرات بھی اپنے ساتھ ایسا کچھ سامان ضرور لاتیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹی کو جو کچھ دیا تھا وہ چونکہ علیؓ کے مہر کی رقم سے خرید وا کر دیا تھا۔ بایں صورت اسے "بری" کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مقابلۃً جہیز کے۔

ہمارے یہاں بری اس سامان کو کہا جاتا ہے جو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اسمیں دلہن کے ملبوسات، زیورات، بناؤ سنگھار کا سامان اور خشک میوہ جات وغیرہ شامل

ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس "بری" کو لڑکی کا مہر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کوئی ہے جو سوچے اور سمجھے؟

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سنن نسائی، جلد ۲۔ رقم الحدیث ۳۳۸۸

۲۔ سنن نسائی مترجم، دوست محمد شاکر، محمد عبدالستار قادری، جلد ۳، ص ۳۳۵۔ فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور، بار دوم، ۲۰۰۰ء

۳۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد باب معاش آل محمد، جلد ۳، رقم الحدیث ۔۱۹۵۳، ص ۵۲۷، بار اول ۱۹۸۳ء، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور۔

۴۔ امام یوسف زرقانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۱۲۲ھ) مصابیح السیر الحمدیہ (فی شرح کتاب المواہب الدنیہ) مطبوعہ ازہریہ مصر۔ ۱۳۲۵ھ میر خواند محمد بن خاوند بن محمود ہروی (متوفی ۹۰۳ھ)۔ روضۃ الصفاتی سیرت الانبیاء والملوک والخلفاء۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ، ۱۸۹۱ء (بحوالہ ادب القرآن، حقوق نسواں اور باہمی تعلقات، مولانا عمر احمد عثمانی، طبع سوم، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۸۔ ۳۴۰، ادارہ فکر اسلامی، گارڈن ایسٹ، کراچی نمبر ۳۔)

مجلس التفسیر کی جانب سے

نوے سالہ **اشاریہ معارف** اعظم گڑھ

(صفحات ۹۳۳، ناشر: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳،

کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ ۷۵۲۷۰)

کی اشاعت پر

محمد سہیل شفیق

استاد شعبہ اسلامی تاریخ،

رکن مجلس ساعدت، مجلس التفسیر

کو دلی مبارکباد

تعدد ازدواج کے قرآنی دلائل

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اسلام کی یہ خصوصیت مذاہب عالم میں اسے ممتاز کرتی ہے کہ اس نے مردوں کی لاتعداد شادیوں کے رواجی قانون کو چار کی حد تک محدود کر دیا ہے۔ جس زمانے میں یہ قانون مسلمانوں کو دیا گیا اس وقت متعدد لوگ ایسے موجود تھے جنکی بیویوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی اور اس قانون (حکم) کے بعد انہیں اپنی باقیماندہ ازواج کو چھوڑنا پڑا۔ مثلاً حضرت نوفل بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے تو انکی پانچ بیویاں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے دیں اور باقی چار کو رکھ لیں۔ (تفسیر کشاف) غیلان بن سلمہ ثقفیؓ ایمان لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں اور وہ سب اسلام قبول کر چکی تھیں۔ انہیں بھی آنحضرت ﷺ نے یہی حکم دیا کہ کوئی چار رکھ لیں باقیوں کو طلاق دے دیں۔ (جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۱۱۳۱، ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۹۵۳) عمیرۃ الاسدیؓ ایمان لائے تو انکی آٹھ بیویاں تھیں آنحضرت ﷺ نے انہیں فرمایا کہ ان میں سے کوئی چار رکھ لو باقی چھوڑ دو۔ حضرت قیس بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں، جب میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو بیان کیا تو آپ نے فرمایا ان میں سے چار منتخب کر لو۔ (سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث ۱۹۵۲، سنن ابوداؤد: رقم الحدیث: ۲۲۴۲)

بیک وقت متعدد ازواج کا رکھنا قرآن مجید کی جن آیات سے معلوم ہوتا ہے ان میں سب سے نمایاں آیت یہ ہے:

وان خفتم الا تقسطو ا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلٰث وربٰع

ط وان خفتم الا تعدلو ا فواحدۃ ۔ (النساء/۳)

اور اگر تمہیں یتیموں کے باب میں ناانصافی کا اندیشہ ہو تو ان (یتیموں کی) ماؤں سے نکاح کرلو۔ دو، دو،

تین تین، چار چار۔ اور اگر تمہیں ان کے مابین ناانصافی کا خوف ہو تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔

گویا آیت جس تناظر میں اتری ہے وہ یتیموں اور بیواؤں کی آبادکاری اور کفالت و نگہداری کے مضمون پر مشتمل ہے۔ مگر اس خصوص میں حالت عموم کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ اگر اس حکم کو اس کے تناظر میں مخصوص یا محدود کر دیا جائے تو قرآن کے دیگر احکام کو بھی اسی اصول کے پیش نظر اس کے مخصوص پس منظر میں محدود کرنا پڑے گا۔ اس طرح قرآن کے بیشتر احکام اپنے اپنے تناظر میں یعنی مخصوص حالات میں تو قابل عمل ٹھہریں گے اور عام حالات میں عمل سے خارج ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی سوچیئے کہ اس طرح کرنے سے قرآن میں آخر بچے گا کیا؟ کہ جنہیں حالات عمومی کے تحت روبہ عمل لایا جائے۔ اس لیئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آیت اصلاً تو بیواؤں سے نکاح کرنے کے سلسلے میں اتری ہے مگر غیر بیواؤں سے نکاح کرنا بھی اس کے ذیل میں آتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے:

اگر تم ڈرتے ہو کہ بالغ یتیم لڑکیوں کے ساتھ (کفالت کے پہلو سے) انصاف نہ کر سکو گے تو (انہیں)

اپنی زوجیت میں لے آؤ۔

ظاہر ہے کہ اس ترجمے کی رو سے بھی ہم ایک حالت خصوص سے نکل کر دوسری حالت خصوص میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر نکاح ثانی پر جو پابندی بیواؤں کے تعلق سے بیان کی جاتی ہے۔ وہی پابندی اب یتیم لڑکیوں کے تعلق سے عائد ہوگی۔ بایں صورت یہاں بھی حالت عموم کا نفاذ نہیں ہو سکے گا۔

دوسری بات یہ کہ عموم و خصوص کی بحث اپنی جگہ، اس آیت سے نکاح ثانی بلکہ نکاح ثالث و رابع تک کے جواز کا استنباط، ہر معمولی عقل والا خود بھی کر سکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ نکاح ثانی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پہلی کو چھوڑ دیا جائے۔ پھر دوسری کی جائے جیسا کہ بعض دانشوروں کا خیال ہے۔ یہاں نکاح ثانی کا حکم ''تعدد ازدواج'' کی صورت میں ہی دیا گیا ہے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)

تعدد ازدواج کی پہلی دلیل مثنیٰ وثلٰث وربٰع ہے۔ جسمیں دو دو، تین تین اور چار چار کی بات کی گئی ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی بیوی کا اصول اگر مستقل اور دائمی اور ناقابل تغیر و تبدل ہوتا تو مثنیٰ وثلٰث

وربٰع کے الفاظ ہرگز استعمال نہ ہوتے۔

دو دو، تین تین اور چار چار کے الفاظ سے مراد یہ ہے کہ یہ تعداد نکاح کرنے والوں کے حالات کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اگر حالات کا تقاضا دو شادیوں کا ہو تو دو کرنی چاہئیں۔ اور اگر حالات تین کی اجازت دیں تو تین۔ علیٰ ھذا القیاس حالات کے مطابق بیک وقت چار تک شادیاں کی جا سکتی ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

دوسری دلیل الا تعدلوا کے الفاظ میں موجود ہے جسمیں عدل کی شرط کا بیان ہے۔ ظاہر ہے کہ عدل کی شرط، بیک وقت متعدد بیویاں رکھنے کی صورت میں ہی عائد ہو سکتی ہے۔ عدل کی اس کڑی شرط نے ضرورت کی ناگزیریت کو تسلیم کرنے کے باوجود بہرحال دوسری شادی سے ایک قسم کی روک ضرور پیدا کر دی ہے۔

مذکورہ بالا آیت کے سیاق میں تعدد ازدواج کا ذکر جس ''ظاہری ضرورت'' کے تحت کیا گیا ہے وہ اصلاً یتیموں یا بیواؤں کی خبر گیری اور سرپرستی کی ضرورت کا پہلو ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) اگر کوئی اسی پہلو سے تعدد پر عمل کرنا چاہے تو ایسا نکاح خالصتاً ''منصوص'' ہوگا۔ مگر یہ اجتہادی اصول بھی سب کو تسلیم ہے کہ جو کام کسی ایک ضرورت کے تحت جائز ہو، وہ اس جیسی کسی دوسری ضرورت میں بھی جائز قرار پاتا ہے۔ اوپر ہم نے ''ظاہری ضرورت'' کے الفاظ لکھے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز ہے ظاہری ضرورت اور دوسری ہے اصل ضرورت۔ ہمارے خیال میں عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت کو ضرورت ظاہری کی ایک شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیئے اس ضرورت کی حالت و کیفیت جہاں اور جس قدر پائی جائیگی۔ وہاں تعدد کی ضرورت بھی اسی کے مطابق ہوتی جائیگی۔ جیسا کہ روزنامہ جنگ کراچی میں ۱۵ جنوری ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی۔ جسکا متن یہ ہے:

> جمہوریہ چیچنیا کے قائم مقام وزیر اعظم رمضان قدیروف نے تجویز دی ہے کہ جنگ کے دوران بہت زیادہ تعداد میں مردوں کی ہلاکت کی وجہ سے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہونی چاہیئے۔ روسی ریڈیو پر گفتگو کرتے ہوئے روس نواز رہنما نے کہا کہ یہ چیچنیا کے لیئے ضروری ہے کیونکہ ہم حالت جنگ میں ہیں اور ہمارے یہاں مردوں کی تعداد عورتوں کی نسبت کم ہے۔ ابھی اس تجویز کی حمایت پارلیمنٹ کے ڈپٹی اسپیکر ولادیمیر ژرینووسکی نے بھی کی ہے۔ روسی قانون میں صرف ایک شادی کی اجازت ہے لیکن اسلامی قانون میں ایک مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔ رمضان